Representation of Crimes Associated with Fake Piri-Muridi in Urdu Novels: A Critical Study

اُردو ناول میں جعلی پیری مریدی کے جرائم کی عکاسی: ایک تنقیدی مطالعہ

Dr. Nadeem Akhtar *[1]
Research Scholar, Nescom, Islamabad.
Dr. Samina Siddiqui*[2]
Assistant Professor, Department Of Urdu, NUML, Islamabad.

[1]☆**ڈاکٹر ندیم اختر**
ریسرچ سکالر، نیسکام، اسلام آباد
[2]☆**ڈاکٹر ثمینہ صدیقی**
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، نمل، اسلام آباد

Correspondance:akhtrndym2@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 26-07-2026
Accepted:29-09-2026
Online:30-09-2026

Copyright:© 2026 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: This study critically examines the representation of crimes associated with fraudulent spiritual leadership and exploitative Pir-Murid relationships in Urdu novels. It explores how the institution of fake piri-muridi is portrayed not merely as a religious deception but as a complex mechanism of social, political, economic, psychological, and sexual exploitation. Through a close reading of selected Urdu novels, the study investigates the ways in which self-proclaimed spiritual figures and hereditary custodians of shrines manipulate religious authority, exploit the trust of disciples, accumulate wealth and property, establish political connections, and construct an artificial image of sanctity through media and public representation. The analysis also focuses on the suppression of individual autonomy, particularly that of women, through coercion, fear, fabricated religious doctrines, forced relationships, and sexual abuse. The study argues that these fictional representations expose the transformation of spiritual authority into a form of social and material power, in which religious

symbolism becomes a means of legitimizing personal interests and institutionalized exploitation. Urdu fiction, therefore, emerges as an important critical space for exposing the hidden structures of power and the social consequences of fraudulent piri-muridi.

KEYWORDS: Fake Piri-Muridi, Spiritual Exploitation, Religious Authority, Political Power, Economic Exploitation, Psychological Control, Sexual Abuse, Urdu Novel, Shrine Culture, Social Power.

اُردو ناول کی تاریخ کم و بیش 160 برسوں پر محیط ہے۔ اس تمام عرصہ میں اردو ناول نگاروں نے جہاں اپنی کہانیوں میں معاشرے کے دوسرے جرائم کو پیش کیا ہے، وہاں جعلی پیری مریدی جیسے جرائم کو بھی کھل کر بیان کیا گیا ہے۔ برصغیر کی یہ سرزمین، ضعیف الاعتقادی کے لحاظ سے بدقسمتی سے شروع ہی سے بہت زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ جہاں پیری مریدی کے نام پر لوگوں کو لوٹا جاتا ہے، یہاں کے عوام گھریلو جھگڑوں، مالی پریشانیوں، اولاد کا نہ ہونا جیسے بے شمار مسائل کا حل ان جعلی بابوں یا جعلی پیروں کے ڈھونڈتے ہیں۔ ان لوگوں کے کمزور ایمان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ جعلی پیر ان عام سادہ لوح عوام کو لوٹنا اپنا حق خیال کرتے ہیں۔ معاشرے کے یہ لٹیرے باعزت بھی ہوتے ہیں اور سنگین مجرم بھی۔

اُردو زبان کے اوّلین ناولوں میں مرزا ہادی رسوا کا ناول "اُمراؤ جان ادا" ایک بہترین ناول ہے جو اپنی منفرد کہانی اور مقامی زمین کے ساتھ جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ زبان و بیان کی چاشنی، لکھنؤ شہر کی شعر و شاعری کا ماحول، نوابوں کی عیاشیاں، بازار حسن کی رنگارنگی آپ کو اس ناول میں جابجا نظر آتی ہے۔ اس ناول کی ابتدا ہی جہاں اغوا جیسے جرم سے ہوتی ہے وہیں اس ناول میں ہمیں شعبدہ باز پیروں سے بھی واسطہ پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ کہانی میں ایک اہم کردار خورشید بیگم کا ہے جو اپنی خوبصورتی میں یکتا ہے۔ اس پر اچھے اچھے کھاتے پیتے لوگ بھی فدا ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ یہاں ناول میں ایک ہلکا سا کردار ڈبل شاہ کا بھی نظر آتا ہے جو کہ معمولی سا جعلی پیر ہے۔ وہ سونے کے زیورات کو ڈبل کرتا تھا۔ ایک دن خورشید بیگم نے اس کو اپنے کڑے، چوڑیاں اور کنگن اُتار کر دیے کہ ان کو ڈبل کر دے۔ اس کے جعلی پیر نے تمام زیورات کو ایک کوری ہانڈی میں ڈالا اور ساتھ یہ کہا کہ سیاہ تل اس ہانڈی میں ڈال دیں۔ ساتھ کورے ململ کے کپڑے سے اس کا ڈھکن باندھ دیں اور مرشد نے یہ بھی کہا کہ کل صبح کھول لینا۔ ان شاءاللہ ایک کے دو ہو جائیں گے۔ یعنی زیورات ڈبل ہو جائیں گے۔ دوسرے دن صبح ہانڈی کھولی گئی لیکن سیاہ تلوں کے علاوہ زیورات غائب تھے۔ یعنی وہ جعلی پیر سونا لے کر رفوچکر ہو گیا تھا۔ اس سارے واقعے کی ناول کے اندر مرزا ہادی نے اس طرح تصویر کشی کی ہے۔

"خورشید بہت ہی بھگی عورت تھی۔ سیکڑوں روپے پھسلا پھیلا کے لوگ کھا گئے۔ فقیر فقراء سے آپ کو بڑا اعتقاد تھا۔ ایک دن ایک شاہ صاحب تشریف لائے ۔ وہ ایک کے دو کرتے تھے۔ خورشید نے اپنے کپڑے اور کنگن کی جوڑیاں اتار دیں۔ شاہ صاحب نے ایک کوری ہانڈی منگوائی، اس میں سیاہ تل بھروادیئے۔ کڑے کنگن ہانڈی میں رکھ کر چپنی ڈھانگ دلی۔ شال باف کا ایک پارچہ گلے میں ناڑے سے باندھ دیا۔ شاہ صاحب روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے کہہ گئے آج نہ کھولنا، کل صبح کو کھولنا مرشد کے حکم سے ایک کے دو ہو جائیں گے ۔ صبح کو ہانڈی کھولی گئی ۔ کالے تلوں کے علاوہ کچھ نہ ملا"(1)

اکیسویں صدی کے جدید اُردو ناول میں بھی ہمیں ان جعلی پیروں کے جرائم پیشہ کردار کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ مرزا اطہر بیگ کے ناول "غلام باغ" میں ہمیں ایک ایسے سائیں بابے کی کہانی ملتی ہے جو ننگ دھڑنگ ایک حجرے میں مقیم ہے اور لوگ اس کی گالیاں سن کر اپنی مرادیں مانگتے ہیں۔ وہاں نذرانے کے نام پر لوہے کا بڑا صندوقچہ بھی رکھا ہوا ہے۔ یہاں ناول نگار کے مطابق ہر مکتبۂ فکر کا بندہ آپ کو ملے گا جو پاگل بابے سے مرادیں مانگنے آیا ہے۔

ملاحظہ ہو:

"اب شریف صورت آدمی کی جگہ ایک بے تاثر چہرے والی دیہاتی عورت اور اس کے ساتھ اس کا بچہ جو کسی کریہہ المنظر جلدی مرض میں مبتلا تھا۔ منتظر کھڑے تھے پھر ایک سوٹڈ بوٹڈ، شرمندہ شرمندہ سا شہری نظر آیا۔ پھر ایک برقعہ پوش عورت جس کے چہرے پر اتنا گہرا غم تھا کہ جیسے ابھی مر جائے گی۔ پھر ایک لڑکھڑاتا ہوا بوڑھا جو ہر شے سے بیگانہ لگتا تھا، اس کے جوان ساتھی اسے دونوں طرف سے سہارا دے کر لائے تھے ۔ پھر ایک بے حد احمق صورت مرد جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر ایک تیز طرار کاروباری جو چاروں طرف مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا۔ پھر ایک کالج کا پروفیسر جو جانتا تھا کہ یہ سب کچھ بے کار ہے لیکن آ گیا تھا۔ اس کا بیٹا کینسر کی آخری سٹیج پر تھا۔ ذلتوں، اذیتوں اور حسرتوں کی وہ قطار ہونی اور انہونی کے بیچ لٹکے پل صراط پر رُک کر آگے بڑھتی تھی"۔(2)

مرزا اطہر بیگ نے زندگی کے ہر طبقہ کے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ ہمارے پیارے پاکستان میں آئے روز کہیں جعلی پیر کے ہاتھوں قتل تو کہیں زنا جیسے سنگین جرائم سرزد ہوتے ہیں۔ ہمارے اخبارات اور سوشل میڈیا کی خبریں ان سے بھری پڑی ہوتی ہیں۔ پیری مریدے نے ہمارے اصلی ایمان کو کمزور کر کے اس میں سوراخ کر دیتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ سے مانگنے کی بجائے ہم جعلی پیروں سے مانگتے ہیں۔ یہاں مجرم وہ معاشرہ یا افراد ہیں جو کمزور ایمان والے لوگوں کی وجہ سے جعلی پیروں کو معاشرے میں سافٹ کارنر حاصل ہے۔ ان جعلی پیروں کی ہاتوں میں آکر خاندانوں کے خاندان تباہ ہو جاماتے ہیں۔ گذشتہ سال ملتان میں ایک جعلی پیر کے کہنے پر ایک نوجوان نے اپنے مکان کی چالیس فٹ تک کھدائی کی۔ پیر کے کہنے کے مطابق نیچے سونا دبا ہوا ہے لیکن مرید خود ملبے تلے دب کر ہلاک ہو گیا اور جعلی پیر وہاں سے بھاگ گیا۔ سرگودھا میں ایک جعلی پیر نے 27 لوگوں کو کلہاڑی سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کیا کہ میں آپ کو زندہ کرلوں گا۔ لیکن آج تک کوئی زندہ نہیں ہوا۔ پشاور میں ایک جعلی پیر نے ایک عورت کے سر میں کیل ٹھونک دی تا کہ عورت کے ہاں لڑکی کی بجائے لڑکا پیدا ہو۔ آئے روز نئے نئے جرائم ان جعلی پیروں کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ کہیں چھری والا بابا، تو کہیں انڈے والا بابا تو کہیں زندہ پیر کے نام سے لوگ اپنا جعلی دھندہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ دین کی خدمت نہیں بلکہ اپنا کاروبار کر رہے ہیں۔ جن کی نشاندہی ہمارے جدید ناول نگاروں نے کی ہے۔

طاہر اقبال کا ناول "نیلی بار" جو 2017ء میں شائع ہوا تھا۔ اس ناول میں ہمیں پنجاب کی ثقافت، پنجاب کی سیاسی، تاریخ، لوگوں کا رہن سہن، رسم و رواج، کلچر، غرض کہ ہر پہلو سے پنجاب کے کلچر کو پیش کیا ہے۔ اس ناول میں ایک کردار پیر اسرار کا بھی ہے جس کی تین چار بیویاں پہلے موجود ہیں لیکن وہ زارا جو ناول کا اہم کردار ہے، سے شادی کرتا ہے۔ زارا پیر اسرار کی چوتھی بیوی ہے جو یونیورسٹی کی پڑھی ہوئی ہے اور اس کا تعلق سیاست اور جاگیر دار خاندان سے ہے۔ پیر اسرار کا دنیاوی کاروبار سیاست ہے۔ جس طرح پیارے پاکستان میں بڑے بڑے گدی نشین سیاست کرتے ہیں، وقت آنے پر یہی لوگ آمریت کے حمایتی بن جاتے ہیں۔ پیری فقیری کی آڑ میں یہ لوگ جرائم کرتے ہیں۔ اصل میں یہ جرائم پیشہ افراد ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں طاہرہ اقبال کی رائے جو کہ ناول کا حصّہ ہے، ملاحظہ ہو:

> "پیر صاحب جس طرح آپ کی درگاہ میں آباؤ اجداد کی قبروں کو پوجنے والے پھٹی ہوئی جیبوں کو جھاڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح اس ملک میں یہ سیاسی گدیاں خود اس ملک سے بھی زیادہ مضبوط ہیں۔ ان سیاسی و مذہبی گدیوں کی حفاظت کے لیے یہ ملک بنا ہے۔ کولو کے بیل یہ عوام الناس شب و روز کی مشقت سے جو تیل نچوڑتے ہیں وہ ان درگاہوں پر چڑھاوے چڑھا جاتے ہیں اور دیے جلا جاتے ہیں۔ جس طرح سیاسی درگاہیں محفوظ ہیں۔ اسی مذہبی

درگاہیں بھی جن میں ایم این اے اور ایم پی ایز پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہ مجبوری ہے سیاست کی، مجبوری فطرت کی، مجبوری نظام کی مجبوری"۔ (3)

ناول "نیلی بار" میں طاہرہ اقبال نے ان جرائم پیشہ افراد کا چرچا جو گدی نشین پلس سیاستدان ہیں بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ کیونکہ مذہب کی آڑ ایک ایسی آڑ ہے جو جرائم پیشہ افراد کا کالر سفید ہی رکھتی ہے۔

محمد الیاس دورِ حاضر کے ایک ممتاز ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول "کہر، برف، حبس، بارش، پروا، دھوپ" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے چھپے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے فکشن میں جعلی پیری مریدی جیسے جرائم کی عکاسی بڑے عمدہ انداز میں کی ہے۔ ناول "برف" میں ایک جانور گدھا جسے بانکا کا نام دیا گیا ہے۔ پیر کا رتبہ اختیار کر گیا تھے لوگ اس گدھے سے اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں جو کہ ان کے کمزور ایمان کی نشانی ہے۔ ایک ادھیڑ عمر سائیں ٹلی گدھے کے نعرے لگاتا تھا۔ اس کی تصویر کشی ناول میں محمد الیاس نے اس طرح کی ہے:

"ایک طویل قامت ادھیڑ عمر سبز پوش ملنگ نے شیخ صاحب کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ سبز رنگ کا صاف ستھرا ٹخنوں تک چوغہ پہنے، سر پر رنگ برنگی تھگلیوں کی ٹوپی رکھے اکثر و بیشتر راسب کے ہاں اور آس پاس آنے لگا، وہ اللہ اکبر، نعرہ رسالت، نعرہ حیدری کے بعد پیر دستگیر سے شروع ہو کر برصغیر پاک وہند کے جتنے اولیا اللہ کے نام اسے یاد تھے، دہرایا کرتا اور بانکے کو جھک کر ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تعظیم پیش کرتا۔ اس کی زلفیں اور داڑھی بے تحاشہ بڑھی ہوئی تھی۔ گلے میں بے شمار مالائیں، گھونگرو اور بڑی سی گھنٹی رکھی ہوتی۔ دونوں کلائیوں میں لوہے کے کڑے اور دسیوں انگلیوں میں بڑے بڑے نگینوں والیاں انگوٹھیاں ہوتیں۔ لوگ اس کو سائیں ٹلی والا کہتے اور وہ بانکے کو "بانکی سرکار" کہہ کر پکارتا)"۔ (4)

لوگ "بانکی سرکار" گدھے کو چھوہارے اور کشمش ڈالتے۔ یہ ہمارے لوگوں کے کمزور ایمان کی نشاندہی کی گئی ہے۔

محمد الیاس نے معاشرے کے اندر ہونے والی ناانصافیاں اور جرائم کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے۔ ہمیشہ انہوں نے جبر کے خلاف لکھا ہے۔ انہوں نے اپنے ناول "حبس" میں ایک مائی "پکھاں والی" کا ذکر کیا ہے۔ جس نے سکول اور کمپیوٹر سنٹر بھی کھول رکھا تھا۔ ایک پیر باباجی ہتھ کڑی والی سرکار کا ذکر ہے جو پیسے لے کر تعویز دم کر کے دیتا تھا۔

الغرض معاشرے کی اصلاح کے لیے جو ادب فکشن کی صورت میں لکھا ہے اس کی معاشرے پر گہری نظر ہوتی ہے اور وہ کڑے سچ سے بھی بڑا سچ ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بہتر معاشرتی نشو و نما کے لیے ایسے عناصر کی کھل کر مذمت کریں۔ ناول "کنجری کے پل" میں یونس جاوید نے ایک جعلی پیر حضرت عطار کا کردار متعارف کرایا ہے جو دیکھنے میں تو انتہائی باپردہ اور باحیا نظر آتا ہے لیکن ایک طوائف نے اس کے ساتھ نکاح کرنے سے انکار کیا۔ اس حضرت عطار نے پہلے طوائف سے کروڑوں روپے لے کر مسجد اور مدرسہ تعمیر کرایا پھر مدرسے کے افتتاح والے دن بہانے سے بلا کر اس کے ڈرائیور کو قتل کراتا ہے۔ لوگوں کو مذہب کے نام پر ورغلا کر لاش کو آگ بھی لگوا دیتا ہے۔ لوگوں کا جتھا مسجد کو بھی سنگسار کر دیتا ہے۔ اس حضرت عطار پر تو 302 دفعہ لگنی چاہیے تھی اور اسے سزائے موت دینی چاہیے تھی لیکن مذہب کے نام پر جرائم پیشہ لوگ اپنا جرم کرتے ہیں تاکہ سزا سے بچ سکیں۔ ناول میں یونس جاوید نے اس کی تصویر یوں کھینچی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "دوستو---، مومنو---فیصلہ ابھی ہونا چاہیئے----۔ میرے سوالوں کا جواب دو۔ بولو----شراب سے وضو جائز ہے؟ بولو---بولو؟؟ ہجوم نے پورے پھیپھڑوں کا زور لگا کر جواب دیا۔----نہیں----بولو کیا سور کے گوشت سے روزہ افطار کیا جا سکتا ہے؟ ہجوم ہم نے جواب میں کہا حرام---حرام، صاحبو-----حرام کی کمائی سے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟؟ زور سے بولو---لوگ پکارے نہیں نہیں نہیں----پھر سوال اٹھایا گیا۔ کیا جسم فروشی کی کمائی سے مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے؟ ہجوم زور سے چلایا----استغفراللہ استغفراللہ"۔ (5)

پھر کیا تھا ہر طرف سے لوگ مٹا ڈالو، ہلاک کر دو، گندگی کو صاف کر دو، نعرہ تکبیر لگتے ہی مسجد و مدرسہ کو گرا دیا گیا۔ اور ڈرائیور احمد خان کو قتل کر کے لاش کو آگ لگا دی گئی۔ جعلی پیری مریدی ہمارے معاشرے کا ناسور ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے قانون اور علماء اپنا کردار ادا دیں۔

> "جب تک عقلمندی کا ثبوت دیتی رہے گی تریاہٹ سے خود کو بچائے رکھے گی۔ بادشاہ گروں کی رضا کو اپنی رضا سمجھے گی ورنہ فتویٰ تو فائلوں میں تیار ---"پیر صاحب اشرافیہ والی ہنسی میں غڑ غوں---"آپ کی مراد اسٹیبلشمنٹ سے ہے نا تاش کے کے یکے جو ہر کوئین پر بھاری پڑتے ہیں۔ یرغمال شاہ جو حکمرانی کے لیے انھی کی محتاج ہے جو اس کے باپ کے قاتلوں کی کابینہ کا حصہ تھے---جانی چور" پیر اسرار نے پھر قہقہ لگایا یہ قہقہ

پھیپھڑوں نے سیروں خون کو پمپ کر کے موٹی گردن کے اکڑاؤ میں الٹا دیا
تھا۔“(6)

طاہرہ اقبال جعلی پیری مریدی کے مسئلے کو محض مذہبی عقیدے کے استحصال تک محدود نہیں کرتیں بلکہ اسے اقتدار کی سیاست اور اشرافیائی مفادات کے ساتھ مربوط کر کے اس کی زیادہ پیچیدہ اور خطرناک صورت سامنے لاتی ہیں۔ پیر اسرار کے کردار کے ذریعے یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ جب روحانی اثر و رسوخ رکھنے والا شخص سیاسی قوت کے مراکز سے وابستہ ہو جاتا ہے تو اس کا مذہبی منصب عوامی رہنمائی اور اخلاقی اصلاح کے بجائے طاقت کے تحفظ کا وسیلہ بن سکتا ہے۔ ”بادشاہ گروں کی رضا“ کو اپنی رضا سمجھنے کا رویہ دراصل اس ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے جس میں مذہبی شخصیت اپنی خود مختاری کھو کر اقتدار کے مراکز کی خوشنودی کو اپنی کامیابی کا معیار بنا لیتی ہے۔ ”فتویٰ“ کا حوالہ اس کردار کی طاقت کے ایک اور پہلو کو آشکار کرتا ہے۔ مذہبی اختیار جب شخصی مفاد اور سیاسی وابستگی کے تابع ہو جائے تو فتویٰ بھی دینی رہنمائی کے بجائے خوف اور دباؤ کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس طرح مذہبی تقدس کو ایک ایسے سماجی ہتھیار میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جس کے ذریعے اختلافِ رائے کو دبایا اور مخالف آواز کو خاموش کیا جا سکتا ہے۔ ناول نگار نے اس رویے کے ذریعے جعلی پیری مریدی کے جرم کو ایک فرد کی فریب کاری سے بلند کر کے اس اجتماعی صورتِ حال سے وابستہ کیا ہے جہاں مذہب کے نام پر پیدا ہونے والا خوف طاقت ور طبقات کے مفادات کا محافظ بن جاتا ہے۔

پیر اسرار کی گفتگو میں اسٹیبلشمنٹ اور حکمران طبقے کا حوالہ اس امر کو بھی واضح کرتا ہے کہ جعلی روحانی اثر و رسوخ اور سیاسی اقتدار ایک دوسرے کے لیے کس طرح معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ سیاسی قوت کو عوامی قبولیت اور مذہبی جواز درکار ہوتا ہے، جب کہ ایسے پیر کو اپنے اثر و رسوخ کے استحکام کے لیے اقتدار کے مراکز کی سرپرستی درکار ہوتی ہے۔ یوں دونوں کے مفادات ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں اور اس تعلق کا نقصان اس عام آدمی کو اٹھانا پڑتا ہے جو مذہبی عقیدت کی بنیاد پر روحانی شخصیت پر اعتماد کرتا ہے۔ اس تناظر میں جعلی پیری مریدی محض مذہبی استحصال نہیں رہتی بلکہ سماجی شعور اور عوامی اعتماد کے استحصال کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

پیر اسرار کی ”اشرافیہ والی ہنسی“ اور اس کے جسمانی تاثر کی منظر کشی بھی اس کردار کی ذہنی ساخت کو واضح کرتی ہے۔ اس کی ہنسی میں روحانی انکسار کے بجائے طبقاتی تفاخر، خود پسندی اور طاقت کا احساس نمایاں ہے۔ طاہرہ اقبال نے کردار کی گفتگو کے ساتھ اس کے ظاہری رویے کو مربوط کر کے یہ تاثر پیدا کیا ہے کہ روحانیت کا لبادہ اوڑھنے والا یہ کردار دراصل اقتدار، دولت اور سماجی برتری کی نفسیات کا حامل ہے۔ اس طرح کردار کی جسمانی ہیئت بھی اس کے اخلاقی اور طبقاتی کردار کی علامت بن جاتی ہے۔

یوں ناول میں جعلی پیر کا جرم صرف مریدوں کو دھوکا دینے یا ان سے مالی منفعت حاصل کرنے تک محدود نہیں رہتا بلکہ مذہبی تقدس کو سیاسی طاقت، طبقاتی مفاد اور سماجی کنٹرول کے لیے استعمال کرنے تک پھیل جاتا ہے۔ طاہرہ اقبال پیر اسرار کے کردار کے ذریعے اس پورے استحصالی نظام کو بے نقاب کرتی ہیں جس میں عقیدت مند عوام کی مذہبی وابستگی، اقتدار کے خواہش مند طبقات کے لیے ایک مفید وسیلہ بن جاتی ہے۔ اس اعتبار سے جعلی پیری مریدی فرد کی اخلاقی گمراہی کے ساتھ ساتھ ایک ایسے سماجی جرم کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو مذہب، سیاست اور طاقت کے باہمی گٹھ جوڑ سے اپنی قوت حاصل کرتا ہے۔

"تو زارا بی بی! بس اسی دان میں پاکستانی سیاست بند ہے۔ کسے الیکشن جتوانا ہے۔ کس کی حکومت بنوانا یا گرانا ہے کس نے کب اپنے ازلی مخالفین کو بھلا کر دشمنوں سے دوستی کر لینی ہے۔ کس کس کو وزیر اور سیکرٹریز لگانا ہے، پھر انھیں کب مری مکھی کی طرح اقتدار کے دودھ سے نکال باہر پھینکنا ہے اور کس کے سر پر اقتدار کا ہما بٹھانا ہے۔ اپنے اپنے حصے کا کٹ اپ ہر ایک کو اچھی طرح سمجھا دیا جاتا ہے۔" آپ جانو۔۔۔ زارا بی بی! پالیٹیکس کی سائنس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لینا اعزاز کی بات سہی، لیکن پاکستانی پالیٹیکس کو سمجھنا ایک الگ ایشو ہے۔۔۔"(7)

پیر اسرار کے کردار میں علمی سند اور روحانی منصب کا یہ امتزاج ایک خاص طنزیہ معنویت پیدا کرتا ہے۔ پی ایچ ڈی جیسی اعلیٰ علمی ڈگری اور عملی سیاست کی "سائنس" میں فرق واضح کرتے ہوئے ناول نگار اس امر کی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ اقتدار کے کھیل کو سمجھنے کے لیے رسمی تعلیم کافی نہیں، بلکہ اس کے پس پردہ موجود مفاداتی تعلقات، خفیہ صف بندیاں اور طاقت کے مراکز کو سمجھنا ضروری ہے۔ پیر اسرار کا یہ دعویٰ دراصل اس کی اس حیثیت کو مضبوط کرتا ہے جس میں وہ مذہبی اور علمی وقار دونوں کو اپنے سماجی اثر و رسوخ کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہاں جعلی پیری مریدی کا ایک بالواسطہ مگر اہم پہلو سامنے آتا ہے۔ ایسا پیر جو مذہبی تقدس کے ساتھ ساتھ سیاسی معاملات کی غیر معمولی بصیرت کا دعوے دار ہو، مریدوں اور عام لوگوں کے سامنے اپنی شخصیت کو زیادہ طاقت ور اور معتبر بنا سکتا ہے۔ مذہبی تقدس، علمی سند اور سیاسی آگہی کا یہ مرکب اسے محض روحانی رہنما کے بجائے ایک ایسے بااثر شخص میں تبدیل کر دیتا ہے جس کی بات کو عام آدمی معمولی رائے کے طور پر نہیں لیتا۔ یوں روحانی منصب کی سماجی طاقت سیاسی شعور اور اقتدار کے تجربے کے ساتھ مل کر ایک اضافی اثر پیدا کرتی ہے۔

طاہرہ اقبال اس کردار کے ذریعے بالواسطہ طور پر یہ سوال بھی اٹھاتی ہیں کہ جب مذہبی شخصیات اقتدار کے کھیل کا حصہ بن جائیں تو ان کی روحانی حیثیت کس حد تک غیر جانب دار رہ سکتی ہے۔ پیر اسرار کے مکالمے میں سیاست کی جو مکاری، موقع پرستی اور مفاد پرستی سامنے آتی ہے، وہ اس کردار کے اپنے مزاج سے الگ نہیں۔ اس لیے ناول میں جعلی پیری مریدی کا مسئلہ صرف مذہبی فریب کا مسئلہ نہیں رہتا بلکہ اقتدار کی ایسی ساخت سے جڑ جاتا ہے جہاں مذہبی اثر و رسوخ، علمی مرتبہ اور سیاسی طاقت ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔ یہی باہمی تعلق پیر اسرار کے کردار کو جعلی پیری مریدی کے ایک زیادہ پیچیدہ اور خطرناک نمونے کے طور پر سامنے لاتا ہے۔

"ہاں جانتی ایک ایسا ایشو جس میں قانون قاعدے آئین اصول سب کی جان
کا طوطا مفادات اور ضروریات کے جن کی قید میں ہے۔۔۔ویسے پیر صاحب
یہ مذہبی امور کی وزارت کے ساتھ ثقافت کا دم چھلا کیوں لگا رکھا
ہے۔۔۔"(8)

زارا فتح شیر کا یہ جواب پیر اسرار کی پوری گفتگو کے اندر پوشیدہ اقتداری منطق کو طنزیہ انداز میں بے نقاب کرتا ہے۔ "قانون، قاعدے، آئین اور اصول" کا مفادات اور ضروریات کے تابع ہو جانا اس سیاسی و سماجی نظام کی عکاسی کرتا ہے جہاں اصول اپنی مستقل اخلاقی حیثیت کھو کر طاقت ور طبقات کی ضرورت کے مطابق استعمال ہونے لگتے ہیں۔ یہی صورتِ حال جعلی پیری مریدی کے معاملے میں بھی دکھائی دیتی ہے، کیونکہ جب مذہبی تقدس، قانون اور سماجی اختیار شخصی مفاد کے تابع ہو جائیں تو روحانی منصب بھی عوامی رہنمائی کے بجائے طاقت کے حصول اور اسے برقرار رکھنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ زارا کا مذہبی امور کی وزارت کے ساتھ ثقافت کے "دم چھلے" کا حوالہ دراصل پیر اسرار کے کردار پر ایک گہرا طنز ہے۔ مذہبی اختیار اور ثقافتی اثرات کو ایک ہی اقتداری دائرے میں دیکھنا اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ پیر اسرار کی سرگرمی محض مذہبی حدود تک محدود نہیں بلکہ وہ سماج کے فکری اور ثقافتی رویوں پر بھی اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں "دم چھلا" کی ترکیب طنزیہ طور پر اس اضافی اختیار کو ظاہر کرتی ہے جو مذہبی منصب کے ساتھ جڑ کر پیر کے اثر و رسوخ کو مزید وسیع کر دیتا ہے۔

زارا دراصل پیر اسرار کے روحانی مرتبے کے پیچھے موجود طاقت کے ڈھانچے کو سوالیہ نشان بناتی ہے۔ ایک طرف وہ پیر کو مذہبی امور سے وابستہ دیکھتی ہے اور دوسری طرف اس کے ثقافتی اختیار پر سوال اٹھاتی ہے۔ اس طرح ناول میں جعلی پیر کی طاقت صرف مریدوں کی عقیدت سے پیدا ہوتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی بلکہ اس کے پیچھے ادارہ جاتی، سیاسی اور ثقافتی اثرات بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ مذہبی شخصیت جب ان مختلف دائروں تک رسائی حاصل کر لے تو اس کی طاقت محض روحانی عقیدت نہیں رہتی بلکہ سماجی کنٹرول کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔

"پیر صاحب نے سگار سلگایا اور سگار والی انگلی اور انگوٹھے سے چٹکی بجائی، جس طرح اپنے عمال کو طلب کرنے کو وہ بجایا کرتے ہیں۔ اک ادا سے دھواں چھوڑا جو جلالی آنکھوں آنکھوں کے گھنے ابروؤں کو مزید گھمبیر بناتا ہوا زارا کے عنابی لپ اسٹک سے سجے ہونٹوں کو چومنے لگا۔ خون کے قطروں جیسے کیوٹکس سجے ہاتھوں سے دھواں ہٹایا اور ولایتی تمباکو کی خوشبو جیسے چڑھ گئی ہو، وہ کھانسنے لگی۔ پیر صاحب نے عمال کو طلب کرنے والی چٹکی پھر بجائی۔"(9)

پیر اسرار کے حرکات و سکنات کی منظر کشی بھی اس اقتداری ذہنیت کو نمایاں کرتی ہے۔ سگار سلگانا، انگلی اور انگوٹھے سے چٹکی بجانا اور اسے اپنے "عمال" کو طلب کرنے کے مخصوص انداز سے جوڑنا اس کردار کے اندر موجود آمرانہ مزاج کی علامت ہے۔ یہاں "عمال" کی اصطلاح خصوصی معنویت رکھتی ہے، کیونکہ اس سے پیر اور اس کے ماتحت افراد کے درمیان روحانی عقیدت کے بجائے حاکم اور تابع کا رشتہ نمایاں ہوتا ہے۔ چٹکی بجانا گویا اس کے لیے حکم صادر کرنے کی علامت ہے؛ وہ اپنے اردگرد موجود افراد کو آزاد ارادے رکھنے والی شخصیات کے بجائے اپنی مرضی کے تابع سمجھتا ہے۔

سگار کا دھواں جب زارا کے چہرے اور ہونٹوں تک پہنچتا ہے اور وہ اسے اپنے ہاتھ سے ہٹا کر کھانسنے لگتی ہے تو اس منظر میں طاقت کے عدم توازن کی ایک علامتی صورت پیدا ہوتی ہے۔ پیر اسرار کے لیے دھواں چھوڑنا اس کے شخصی اطمینان اور خود نمائی کا اظہار ہے، جب کہ زارا کے لیے وہی دھواں ناگواری اور گھٹن کا باعث بنتا ہے۔ یوں ایک ہی منظر میں دونوں کرداروں کی حیثیت کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے: ایک طرف وہ شخص ہے جو اپنی خواہش اور اختیار کے اظہار میں آزاد ہے، دوسری طرف وہ عورت ہے جو اس کے پیدا کردہ ماحول میں اپنے لیے جگہ بنانے پر مجبور دکھائی دیتی ہے۔

اس منظر کی معنویت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب اسے زارا کو چوتھی بیوی بنانے کے پس منظر میں دیکھا جائے۔ یہاں عورت کو محبت، رفاقت یا مساوی انسانی تعلق کے بجائے طاقت کے اظہار اور شخصی خواہش کی تکمیل کے ایک وسیلے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ زارا کے بھائی کو وزارت دینا اور اس کے بدلے زارا کو اپنے نکاح میں لانا اس پورے معاملے کو ایک ایسے مفاداتی بندوبست میں تبدیل کر دیتا ہے جس میں سیاسی اختیار اور عورت کی ازدواجی حیثیت باہم منسلک ہو جاتے ہیں۔ اس طرح طاہرہ اقبال جعلی پیری مریدی کے ایک ایسے جرم کو سامنے لاتی ہیں جس میں مذہبی تقدس کے پردے میں عورت کی خودمختاری کو محدود کر کے اسے اقتدار کے مفاداتی کھیل کا حصہ بنا دیا جاتا ہے۔

"پیر خانوں میں وہی زبان بولی جاتی ہے جو عمال بلوانا چاہیں یہ اپنی بولی آپ کیسے بولنے لگی۔ وہی مذہب شرع کہا جاتا ہے جو درگاہ کی ضرورت ہو۔ یہ

درگاہی شریعت میں اپنی شرح کہاں سے لے آئی۔ اسی سبق کا رٹا بار بار لگایا جاتا ہے جو درگاہ میں یاد کروایا ہے۔ اس میں زیر زبر کی تبدیلی بھی گناہ تحریف ہے، نہ اس میں اپنی بولی کی ملاوٹ، کاذب، کافر،، دوزخ کے تنور کا ایندھن۔۔۔"(10)

پیر خانہ ایک ایسے اقتداری نظام کی صورت اختیار کرلیتا ہے جہاں فرد کو اپنی زبان، اپنی سوچ اور اپنے شعور کے اظہار تک کی آزادی حاصل نہیں رہتی۔ عذرا کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ درگاہ میں وہی زبان معتبر ہے جو وہاں کے عمال اور پیر کی ضرورت کے مطابق ہو۔ اس طرح مذہبی تقدس کی آڑ میں ایک ایسا ذہنی نظم قائم کیا جاتا ہے جس میں اپنی رائے رکھنا بھی بغاوت کے مترادف قرار پاتا ہے۔ "اپنی بولی" کا جرم بن جانا دراصل فرد کی فکری آزادی کو سلب کرنے کی علامت ہے۔ عذرا سے اس کی اپنی زبان چھین کر اسے پیر خانے کی مقرر کردہ زبان سکھائی جاتی ہے تاکہ وہ سوال کرنے، اختلاف کرنے یا اپنے تجربے کو اپنی زبان میں بیان کرنے کے قابل نہ رہے۔

اس ذہنی استحصال کی بنیاد مذہبی خوف پر قائم ہے۔ "کاذب، کافر، دوزخ کے تنور کا ایندھن" جیسے الفاظ ایک ایسی نفسیاتی فضا تشکیل دیتے ہیں جس میں معصوم اور کمزور فرد کو ہر وقت گناہ، کفر اور جہنم کے خوف میں مبتلا رکھا جاتا ہے۔ مذہب یہاں روحانی تسکین اور اخلاقی تربیت کا وسیلہ نہیں رہتا بلکہ اطاعت پر مجبور کرنے کا ہتھیار بن جاتا ہے۔ پیر خانے کی اپنی بنائی ہوئی شریعت کو حرفِ آخر قرار دینا اور اس سے معمولی انحراف کو بھی "تحریف" اور گناہ بنا دینا جعلی مذہبی اختیار کی اس ساخت کو ظاہر کرتا ہے جس میں مقدس اصطلاحات کو شخصی اقتدار کے تحفظ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ عذرا کی کم سنی اور اس کی بے بسی اس صورتِ حال کو مزید سنگین بناتی ہے۔ اس کے بھائی اسے پیر صاحب کی خدمت کے لیے چھوڑ جاتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خاندانی اعتماد اور مذہبی عقیدت مل کر کس طرح ایک معصوم لڑکی کو ایسے ماحول میں پہنچا دیتے ہیں جہاں اس کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں۔ خدمت کے نام پر ایک کمزور لڑکی کو پیر خانے کے اختیار میں دے دینا دراصل اس استحصالی نظام کے لیے انسانی وسائل فراہم کرنے کے مترادف ہے۔ یہاں مذہبی عقیدت خاندان کو اس حقیقت سے غافل کر دیتی ہے کہ جس شخصیت کے حوالے بچی کی ذمہ داری کی جا رہی ہے، وہ خود طاقت اور تقدس کے امتزاج سے غیر معمولی اختیار حاصل کیے ہوئے ہے۔ پیر اسرار کے روپ میں کئی اور بھی جعلی پیر موجود ہیں جو، جسموں، ذہنی اور عزتوں کا استحصال کرنے کے ساتھ ساتھ ناجائز زمینوں اور وراثتوں پر قابض نظر آتے ہیں۔ اصغر ندیم سید اپنے ناول "ٹوٹی ہوئی طناب ادھر" میں سجادہ نشین پیر قربان علی عرف بہار علی شاہ کے شہر بانو پر قابض ہونے کو یوں بیان کرتے ہیں:

"اب ایسا ہوا کہ چند دن کا وقفہ پڑا اور مخدوم صاحب قربان علی شاہ عرف سجادہ نشین بہار علی نے ناناجان کو طلب کر کے اپنا حکم سنا دیا کہ جسے میں نے اپنا نام دیا تھا "شہر بانو" اب اس رشتہ مانگ رہا ہوں۔ گود میں بٹھایا تو کیا ہوا؟ مرد کا اصل تو مرد ہی کا اصل ہوتا ہے۔"(11)

اس واقعے میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ پہلو عمر اور اختیار کا غیر معمولی عدم توازن ہے۔ جس بچی کو پیر نے بچپن میں اپنی گود میں بٹھایا، وہ اس کی اپنی بیٹی سے بھی کم عمر ہے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہی بچی اس کی نظر میں نکاح کے قابل ایک ایسی شے بن جاتی ہے جس پر وہ اپنے روحانی مرتبے کی بنیاد پر حق جتاتا ہے۔ بچپن کی شفقت کو ازدواجی حق میں تبدیل کر دینا انسانی تعلقات کی ایک بنیادی اخلاقی حد کو پامال کرتا ہے۔ یہاں پیری مریدی کی عقیدت ایک ایسے جواز میں تبدیل ہوتی دکھائی دیتی ہے جو پیر کو دوسرے انسان کی زندگی کے فیصلے میں غیر معمولی اختیار فراہم کرتا ہے۔ "مرد کا اصل تو مرد ہی کا اصل ہوتا ہے" کا جملہ اس کردار کی جنسی ذہنیت کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ اس میں عورت کی شخصیت، رضامندی اور جذبات کی کوئی معنویت باقی نہیں رہتی؛ مرد کی خواہش ہی فیصلہ کن قوت بن جاتی ہے۔ شہر بانو کا نکاح اس کی مرضی یا پسند کا نتیجہ نہیں بلکہ پیر کے حکم اور خواہش کا نتیجہ بنتا ہے۔ یوں عورت ایک خود مختار فرد کے بجائے مردانہ اختیار کے تابع وجود میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پیری مریدی کا تقدس اس مردانہ اختیار کو مزید مضبوط کرتا ہے، کیونکہ پیر کی خواہش کو محض ایک فرد کی خواہش نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے روحانی مرتبے کے پردے میں قبول کرنے کا سماجی دباؤ بھی موجود ہوتا ہے۔

یہاں "وراثت" کا تصور بھی خاص معنویت رکھتا ہے۔ مرید کی بچی کو پیر کی روحانی میراث یا اپنے حق کا حصہ سمجھنے کی ذہنیت دراصل پیری مریدی کے اس جاگیردارانہ تصور کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں عقیدت کا رشتہ رفتہ رفتہ ملکیت کے رشتے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مرید اپنی عقیدت کے باعث پیر کو غیر معمولی تقدس عطا کرتا ہے، جبکہ پیر اسی تقدس کو اپنے اختیار کی توسیع کے لیے استعمال کرتا ہے۔ نتیجتاً مرید کا خاندان بھی اس کے اثر سے باہر نہیں رہتا اور اس کی اولاد تک پیر کی خواہشات کا ہدف بن سکتی ہے۔

"شاید اس سے بھی پہلے سے جب برصغیر پر اسلام کا سورج چمکا تھا۔ گدی تو محکمہ اوقاف کے قبضے میں تھی مگر سجادہ نشین مخدوم قربان علی شاہ عرف بہار علی سیاسی اثر و رسوخ کی وجہ سے بہت سے حقوق پر قابض تھا۔ ایک تو اس نے درگاہ کے اطراف کی زمینیں، ملی بھگت سے اپنے نام کرالی تھیں۔ دوسرے مریدین میں اُس کی دھاک بٹھانے کے لیے پورا ایک محکمہ موجود تھا۔ اس میں نیم ادیب، نیم صحافی، نیم دکاندار نیم پرجوئیے نیم پبلسٹی

ماسٹرز شامل تھے جو سجادہ نشین کے لیے وقتاً فوقتاً مذاکرے، سیمینار
، اور صوفی نائٹس قسم کے پروگرام کرتے رہتے تھے۔ جن میں کرائے کے
دانشوروں کو باقاعدہ لفافے تقسیم ہوتے تھے۔ اخباروں کے رپورٹرز
اور ایڈیٹروں کی خدمات بھی باقاعدہ حاصل کی جاتی تھیں۔"(12)

اصغر ندیم سید ٹوٹی ہوئی طناب میں سجادہ نشین مخدوم قربان علی شاہ عرف بہار شاہ کے کردار کے ذریعے پیری مریدی کے اس ادارہ جاتی پہلو کو سامنے لاتے ہیں جہاں روحانی منصب سیاسی اثر و رسوخ اور معاشی مفادات کے حصول کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ گدی کا محکمۂ اوقاف کے قبضے میں ہونے کے باوجود سجادہ نشین کا سیاسی اثر و رسوخ کی بنیاد پر مختلف حقوق پر قابض رہنا اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ مذہبی منصب کی طاقت رسمی انتظامی اختیار سے کہیں زیادہ وسیع ہو سکتی ہے۔ درگاہ سے ملحق زمینوں کو مبینہ ملی بھگت کے ذریعے اپنے نام کرانا روحانی اقتدار کے معاشی استحصال میں تبدیل ہو جانے کی واضح صورت ہے۔ یہاں مریدوں کی عقیدت سے حاصل ہونے والا سماجی اثر صرف مذہبی وقار برقرار رکھنے کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ مادی وسائل اور ملکیتی مفادات کے حصول میں بھی بروئے کار آتا ہے۔ اس طرح سجادہ نشینی روحانی خدمت کے تصور سے ہٹ کر طاقت، زمین اور مفاد کے ایک ایسے نظام کی شکل اختیار کرتی ہے جس میں مذہبی تقدس ذاتی اقتدار کو مضبوط کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

ناول نگار نے سجادہ نشین کی دھاک قائم رکھنے کے لیے قائم کیے گئے غیر رسمی تشہیری نظام کی تفصیل کے ذریعے اس استحصالی طاقت کی ایک اور سطح بے نقاب کی ہے۔ نیم ادیبوں، نیم صحافیوں، پبلسٹی سے وابستہ افراد، مذاکروں، سیمیناروں اور "صوفی نائٹس" کے ذریعے ایک مخصوص روحانی شبیہ کی مسلسل تشکیل اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ پیر کی طاقت صرف عقیدت مندوں کے اعتقاد سے نہیں بلکہ تشہیر اور مصنوعی عوامی وقار سے بھی پیدا کی جاتی ہے۔ کرائے کے دانشوروں کو معاوضے کی ادائیگی اور اخبارات کے رپورٹرز و ایڈیٹروں کی خدمات کا حصول اس تقدس کی مصنوعی تشکیل کو مزید واضح کرتا ہے۔ یوں ٹوٹی ہوئی طناب میں جعلی پیری مریدی محض ایک فرد کی فریب کاری نہیں رہتی بلکہ مذہبی تقدس، سیاسی اثر و رسوخ، معاشی مفاد اور ابلاغی طاقت کے باہمی اشتراک سے قائم ہونے والے ایک منظم اقتداری ڈھانچے کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اس تناظر میں سجادہ نشین کی "دھاک" دراصل عقیدت سے زیادہ اس طاقت کا نتیجہ ہے جو زمین، سیاست، تشہیر اور سماجی مرعوبیت کے مختلف ذرائع کو اپنے حق میں استعمال کرتی ہے، اور یہی پہلو جعلی پیری مریدی کے جرم کو انفرادی فریب سے بڑھا کر ایک ادارہ جاتی اور سماجی استحصال کی صورت عطا کرتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ ہادی رسوا، مرزا، امراؤ جان ادا، لاہور: تخلیقات، 1999ء، ص:298

2۔ اطہر بیگ مرزا، غلام باغ، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، 2021ء، ص:181

3۔ اقبال طاہرہ، نیلی بار، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2017ء، ص:304

4۔ محمد الیاس، برف، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2010ء، ص:404

5۔ جاوید یونس، کنجری کا پل، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، 2011ء، ص:152

6۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص:۳۰۰

7۔ ایضاً، ص:۳۰۱

8۔ ایضاًص:۳۰۲

9۔ ایضًا، ص:۳۰۴

10۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص:۳۱۹۔۳۲۰

11۔ اصغر ندیم سید، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص ۱۲۹

12۔ ایضاً، ص:۱۳۴۔۱۳۵

Reference:

1. Mirza Hadi Ruswa, Umrao Jan Ada, Lahore: Takhleeqat, 1999, p. 982.
2. Mirza Athar Baig, Ghulam Bagh, Lahore: Al-Hamd Publications, 2021, p. 181.
3. Tahira Iqbal, Neeli Bar, Islamabad: Dost Publications, 2017, p. 304.
4. Muhammad Ilyas, Baraf, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2010, p. 404.
5. Younas Javed, Kanjri Ka Pul, Lahore: Jumhoori Publications, 2011, p. 152.
6. Tahira Iqbal, Neeli Bar, Islamabad: Dost Publications, 2017, p. 300.
7. Ibid, p. 301.
8. Ibid, p. 302.
9. Ibid, p. 304.
10. Tahira Iqbal, Neeli Bar, Islamabad: Dost Publications, 2017, p. 319-320.
11. Asghar Nadeem Syed, Tooti Hui Tanab Idhar, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2019, p. 129.
12. Ibid, p. 134-135.